پڑھوائی جاتی ہے۔ اوراس بات کی تاکید کی جاتی ہے کہ طلباء نظم کولطف کے ساتھ پڑھیں اور پڑھتے وقت مصرعوں کی موزونیت، آہنگ اورزیروبم کا خیال رکھیں۔ موثر پیرائے میں پڑھنے سے طلباء خود بھی لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ اور سننے والے کے جذبات کو بھی متاثر کرسکتے ہیں۔

غرض نظم کی تدریس کے لئے کوئی واحد تجویز نہیں پیش کی جاسکتی اور نہ کسی ایک طریقۂ تدریس کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ اس کی کامیابی کا بہت کچھ انحصار استاد کے انفرادی ذوق پر ہے۔ وہ اساتذہ جو اپنے مذاق اور طالب علموں کے ذہن کو سمجھتے ہیں اپنا انفرادی طریقہ تدریس دریافت کرلیتے ہیں۔

رباعی کا خزانہ

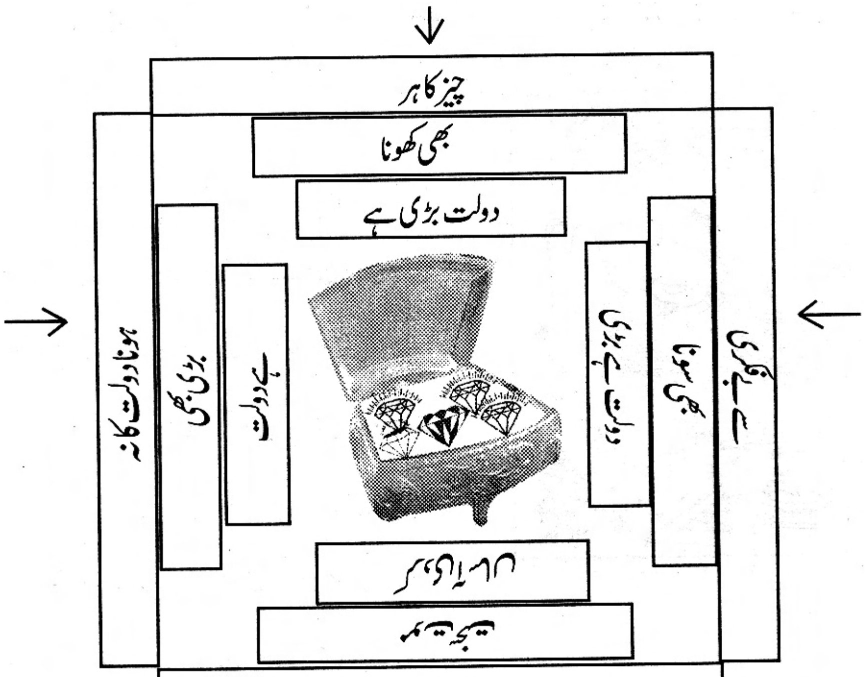

1 ہر..........کھونا..................دولت ہے۔

2 ....سے سونا بھی..................ہے۔

3 افلاس نے..............موت..................کردی۔

4 دولت..............بھی..................ہے

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے
بےفکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کردی
دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

XVIII-افسانے کی تدریس کا طریقۂ کار

Methodology of Teaching Short Story

اردو شاعری میں جس طرح غزل کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔اسی طرح اردو نثر میں اگر کوئی صنف سب سے زیادہ مقبول ہے تو وہ مختصر افسانہ ہے۔ دنیائے ادب میں اپنی کم عمری کے باوجود یہ بات بلاخوف وتردید کہی جاسکتی ہے کہ افسانے میں ایک نہیں بلکہ درجنوں نام ایسے ہیں جو عالمی معیار پر نہ صرف پورے اترتے ہیں بلکہ اس کے قد کو کافی اونچا کرتے ہیں۔ہائی اسکول اور ہائیر سکنڈری اسکول کی سطح پر انصاف میں سرسری مطالعے (Non Detailed Study) کے تحت کوئی خاص افسانوی مجموعہ یا مختلف افسانہ نگاروں کے منتخب افسانے شامل کئے جاتے ہیں۔افسانے کی تدریس کے دوران مندرجۂ ذیل ہدایات پہ عمل کیا جائے۔

افسانے کی اہم خصوصیت اس کا اختصار اور ایجاز ہے وحدتِ تاثر اس کی بڑی خوبی ہے۔افسانے میں عام طور پر کہانی، کردار، مکالمے اور واقعات ہوتے ہیں لیکن ہر افسانے کے لئے ان کا ہونا لازمی نہیں ہے۔افسانہ ان کے بغیر بھی لکھا جاسکتا ہے، لیکن بعض بنیادی باتیں ایسی ہیں جن پر اتفاق کیا جاسکتا ہے۔

افسانہ مختصر ہونے کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ اس کو کلاس روم میں لفظاً لفظاً پڑھا جائے افسانے کی قراءت کلاس روم میں کم از کم دوبار ہونی چاہئے۔پہلی بار افسانہ بلند آواز میں استاد کو پڑھنا چاہئے۔ جسے افسانے کی بلند خوانی کہا جائیگا اس سلسلے میں استاد کو چاہئے کہ وہ اپنی بلند خوانی کو موثر بنانے کے لئے کلاس روم میں پڑھنے سے پہلے اسے ایک بار تنہائی میں پڑھ لے تاکہ اوقاف، لہجے کے اتار چڑھاؤ، مکالموں کے زیروبم فجائیہ، ندائیہ، استفہامیہ جملوں اور مکالموں کی موزوں ادائیگی میں آسانی ہو۔اس طرح وہ افسانے نگار کے تجربے کو اپنے رگ وپے میں اتار لے افسانہ ہر تخلیقی صنف کی طرح ایک جذباتی اور جمالیاتی تجربہ ہوتا ہے استاد اس تجربے میں پورے وفور کے ساتھ شریک ہو۔تبھی طلبہ تک اس کی ترسیل زیادہ موثر طریقے سے ہوسکتی ہے۔

افسانے کی بلند خوانی کے دوران استاد کو ہر طرح کی تشریح وتعبیر سے گریز کرنا چاہئے۔اس کی تشریح کے بغیر بھی محض بلند خوانی افسانے کے کئی پہلوؤں کو واضح کردے گی۔اس دوران طلبہ کے ذہن میں سوالات جنم لے سکتے ہیں۔ لیکن ان کی زبان کو کچھ دیر کے لئے پابند رکھنا چاہئے۔یہ بہت ضروری ہے تاکہ اس افسانہ خوانی کے تسلسل میں کوئی خلل

نہ پڑے۔

افسانے کی پہلی قراءت میں افسانے کی تمام خوبیاں طلبہ پر واضح نہیں ہوسکیں گی لیکن افسانہ فہمی کی ایک فضا ضرور تیا ہوجائے گی اور وہ ذہنی طور پر بہت سی باتیں معلوم کرنے کے لئے بے چین ہوں گے۔ اس طریقۂ کار کے ذریعہ وہ افسانہ خوانی کے طریقے سے آگاہ ہوجائیں گے اور تحسین شناسی کی تربیت بھی ہوجائیگی۔ یہاں یہ بھی لحاظ رہے کہ افسانہ ایک ہی نشست میں پورا سنا دیا جائے۔ دو تین گھنٹوں میں بانٹا نہ جائے وحدتِ تاثر افسانے کا ایک اہم وصف ہے پہلی قراءت میں طلبہ پر اس کا نقش ثبت ہوجانا چاہیئے۔ اس کے بعد افسانے کی تفہیم اطمینان سے کئی گھنٹوں میں ہوسکتی ہے۔

دوسرے مرحلے میں طلبہ کے تعامل کو اکسایا جانا چاہیئے۔ افسانے کے مختلف پہلوؤں پر ان کے تاثرات طلب کرنے چاہیں کیا حقیقت میں ایسا واقعہ ہوسکتا ہے؟ کیا کرداروں کا عمل فطری تھا؟ انجام سے کیا تاثر حاصل ہوتا ہے؟ افسانے میں بعض بلیغ جملے ہیں تو ان سے کیا مفہوم برآمد ہوتا ہے؟ یہ افسانے پر منحصر ہے کہ آپ اس میں سے کون سے سوالات قائم کرتے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب طلبہ سے سن لینا چاہیئے۔ لیکن تبصرے سے گریز کرتے ہوئے اپنی تشریح وتعبیر کو ابھی محفوظ رکھنا چاہیئے یہ بھی ضروری ہے کہ افسانہ خوانی سے پہلے اور طلبہ سے تعامل کے دوران افسانہ نگار اور اس کے کارناموں کا تعارف ہرگز نہ کرایا جائے۔

اگلی افسانہ خوانی طلبہ سے کرائی جائے تو بہتر ہوگا کہ افسانے کے ایسے حصوں پر پہلے سے نشان لگایا جائے۔ جہاں وقفہ دے کر الفاظ وتراکیب کے معنی، افسانے کی فضا بندی، عمل اور مکالموں کی روشنی میں کرداروں کی خصوصیات، بلیغ جملوں کا مفہوم وغیرہ نمایاں کیا جاسکے اور اسی دوران طلبہ سے حاصل شدہ تاثرات کا حوالہ دیتے ہوئے موزوں مقامات کی وضاحت کی جائے۔ افسانے کی تکنیک کی خوبیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی بھی کی جائے۔ افسانے کے انجام پر پہنچ کر خاموشی کا ایک وقفہ ضرور دینا چاہیئے۔ انجام چونکانے والا ہو، بظاہر کسی نتیجے پر پہنچانے والا نہ ہو، کسی افسانے کی گتھی کو سلجھانے والا ہو، کیسا ہی ہو ایک خاموش وقفہ دینا ضروری ہے تاکہ آخری تاثر کی شدّت انگیز کی جاسکے۔

اختتام پر افسانے کو کلی حیثیت سے سمیٹے جانے کے کئی امکانات ہوں گے ان میں افسانے کا مرکزی خیال ہوگا۔ افسانہ نگار کا نقطۂ نظر ہوگا۔ افسانے کے بطن میں موجود کئی بلیغ فقروں کی معنویت اچانک روشن ہوجائے گی۔ یہ ساری بصیرت استاد کو فراہم کرنی چاہیئے اور اسی مرحلے پر افسانہ نگار کا تعارف، اس کے نظریۂ حیات اور اس کے دوسرے

افسانوں وغیرہ کا ذکر آنا چاہئے۔

افسانے کی تدریس کے مذکورہ طریقۂ کار میں سب سے اہم پہلو افسانے کی پہلی بلند خوانی ہے۔ جس سے کسی طرح گریز نہیں کیا جاسکتا افسانے کی صحیح طور پر تفہیم اور تحسین شناسی کے لئے اس کا لفظ بہ لفظ پڑھا جانا اور سنا جانا بنیادی تقاضہ ہے اسے پورا کئے بغیر افسانے کی تدریس غیر اطمینان بخش ہوگی۔

طریقۂ تدریس کے دوسرے مرحلے میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں لیکن اسے یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ افسانہ کس تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ ہمارے اولین افسانہ نگار پریم چند کو لیجئے۔ پریم چند کے افسانوں میں واقعہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ پریم چند کے ہاں افسانے کی عمارت ایک واضح واقعے پر استوار ہوتی ہے۔ واقعہ شروع ہوتا ہے اور مرحلہ بہ مرحلہ گزرتا ہوا انجام پر پہنچتا ہے۔ کردار واقعات کے تابع ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں بڑے گھر کی بیٹی، حج اکبر، بوڑھی کاکی، پوس کی رات، نمک کا داروغہ، نجات، کفن کسی بھی افسانے کو لیجئے۔ ایسے افسانوں کی تدریس نسبتاً آسان ہے۔ افسانہ، استاد اور طالب علم ایک ساتھ قدم ملا کر چلتے ہیں۔ ایک ساتھ واقعات میں شریک ہوتے ہیں اور ایک ساتھ انجام پر پہنچتے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ افسانہ نگار بھی بیچ بیچ میں شریک ہوجاتا ہے اور سمجھاتا بھی جاتا ہے۔ اور افسانے کے اختتام پر اپنا نقطۂ نظر ذہن نشین کرا کے رخصت ہوجاتا ہے۔

مثال:

محاوروں کا چکر

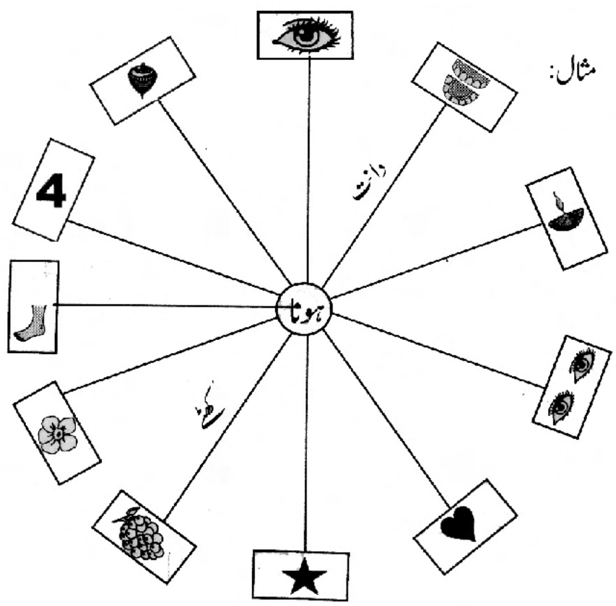

جوابات:

آنکھ کا تارا ہونا۔ دانت کھٹے ہونا۔ چراغ پا ہونا۔ چراغ گل ہونا۔ آنکھیں چار ہونا۔ دل لٹو ہونا

XIX- نظم کی تدریس کا طریقۂ کار

Methodology of Teaching Poetry

جذبات اور تخیلات کا منظّم اور موزوں اظہار نظم کہلاتا ہے۔معین الدین صاحب نے اپنی کتاب ''اردو زبان کی تدریس'' میں نثر کو چلنے سے اور نظم کو رقص کرنے سے تعبیر کیا ہے یہاں نظم سے مراد شاعری ہے۔مولانا شبلی کے نزدیک جو جذبات الفاظ کے ذریعہ ادا ہوں شعر ہیں، ساؔحر کہتے ہیں کہ۔

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں

جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

نظم سے مراد قصیدہ ہے نہ مرثیہ، نہ مثنوی، نہ شہرآ شوب، نہ واسوخت بلکہ وہ صنف ہے۔ جسے ہم محض ''نظم'' ہی کہتے ہیں۔اردو شاعری کی چار بڑی اور اہم اصناف مثلاً غزل ،قصیدہ ،مثنوی اور مرثیہ کے علاوہ عہد جدید میں نظم کے ارتقاء اور اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اسے اردو شاعری کی پانچویں اہم اور بڑی صنف قرار دیا جاسکتا ہے۔موجودہ عہد میں نظم اپنی پوری طاقت وتوانائی کے ساتھ غزل کے دوش بدوش آگے بڑھ رہی ہے۔اس لحاظ سے جدید شاعری میں غزل اور نظم کو دو اہم اصناف قرار دیا جاسکتا ہے۔نظم موضوعات اور ہیئتوں کے لحاظ سے اس قدر متنوع اور ہمہ گیر صنف ہے کہ اس کے ساتھ کسی ایک یا چند موضوعات اور ہیئتوں کو مختص نہیں کیا جاسکتا۔زندگی کے ہر واقعہ، ہر واردات، ہر مظہر، ہر انگ ، ہر جذبہ، ہر احساس، ہر کیفیت کو نظم کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔لہٰذا یہ صنف موضوعی اصناف کی صف میں نہیں بٹھائی جاسکتی اور نہ اسے ہیئتی اصناف کے خانے میں رکھا جاسکتا ہے۔اس لئے کہ اس کی کوئی مخصوص ہئیت بھی نہیں ہے۔قدیم زمانے سے ہی یہ مختلف ہئیتوں میں پیش کی جاتی رہی ہے۔پہلے نظم کے لئے قافیہ اور مخصوص بحر کی پابندی ضروری سمجھی جاتی تھی لیکن جدید نظم نے یہ تمام پابندیاں توڑ دی ہیں۔جدید نظم بے قافیہ بھی ہوسکتی ہے اور بے بحر بھی آج کل نثری نظمیں بھی لکھی جارہی ہیں۔

نظم کی تدریس کے مقاصد:

۱۔ تدریس نظم کا اوّلین مقصد یہ ہے کہ طلباء نظم کے اشعار کو موثر پیرائے میں پڑھ کر ان سے لطف اندوز ہوں۔

۲۔ ان جذبات سے متاثر ہوں جن کو شاعر کی جذباتی طبیعت نے اشعار میں پیش کیا ہے۔تاکہ طالب علم میں ذوقِ

ادب اور لطف سخن پیدا ہو۔

۳۔ تدریس نظم میں اس بات کا خاص اہتمام کیا جائے طلباء شاعر کا صحیح تخیل وتصور اپنے ذہن میں لاسکیں اور دوسرے شعرا کے اشعار مقابل میں پیش کرسکیں۔

۴۔ اخلاقی نظمیں، بچوں کی عادتیں سنوانے، ان جذبات کی صحیح نشو ونما اور ان کی تربیت کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔

۵۔ نظم کے ذریعے بچوں میں خدا پرستی، ایثار وقربانی، رحم دلی، سچائی اور دیانت داری کا جذبہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔

۶۔ نظم کے ذریعے بچوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ غم ہو یا خوشی، نظم ہر صورت میں ہمارے لئے فرحت، سکوں اور اطمینان کے سامان بہم پہنچاتی ہے۔ نظم بہترین قسم کی تفریح ہے۔

۸۔ کلاس میں ایک شاعرانہ کیفیت پیدا کی جائے تا کہ طلباء میں شعری جذبہ پیدا ہو اور وہ اشعار لکھنے پر آمادہ ہوسکیں۔

تدریس نظم کے مختلف طریقے: تدریس نظم کے مندرجۂ ذیل طریقے قابل غور ہیں۔

۱۔ غنائی وادا کاری کا طریقہ Song and action method

۲۔ افہام وتفہیم کا طریقہ Meaning Method

۳۔ تشریح کا طریقہ Exposition method

۴۔ مکالمے کا طریقہ Discourse method

۵۔ موازنہ کا طریقہ Comparison method

۶۔ تنقید ولطف اندوزی کا طریقہ Appreciation method

ان طریقوں میں سے کوئی بھی طریق کار انفرادی طور پر موثر ومکمل نہیں ہے۔ لیکن تدریسِ نظم میں ہر طریقِ کار کا کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور شامل ہوتا ہے۔ بعض ایسی نظمیں ہیں جو اپنی غِنائیت کی وجہ سے دل میں پیوست ہو جاتی ہیں اور بعض نظموں کو انداز وادا سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ نظم پڑھانے سے قبل ثقیل الفاظ کے معنی بتانا اور محاورات واشارات کی وضاحت ضروری اور بہتر ہے۔ اس سے نظم سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ پھول کی تمام پنکھڑیوں کو

جدا کرنے سے پھول کا حُسن ، بالیدگی وا کائی (اجتماعیت) کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔اسی طرح اشعار کوصرف معنوی اوزار سے جزّ اکی کرنے سے شعریت دم توڑ دیتی ہے۔طریقِ تشریح یا مکالمہ یا موازنہ سے بھی تدریس نظم ہوسکتی ہے۔کوشش یہ ہونی چاہئے کہ طلبہ زیادہ سے زیادہ اشعار کی شعریت سے لطف اندوز ہوں۔کسی بات کے معنی کو سمجھ لیناہی انسان کے نزدیک سب سے اہم شئے نہیں ہے۔اسی طرح تدریس نظم کا مقصد صرف معنی سمجھا دینا نہیں ہے بلکہ دل میں ایک اثر پیدا کرکے اسے متحرک کرنا ہے۔

نظم کیسے پڑھائیں؟ نظم اور نظم پڑھانے والے میں ایک گہرا اور قریبی رشتہ ہوتا ہے۔اس قریبی رشتہ کے درمیان استاد کا کوئی مقام نہیں۔استاد کا کام طلباء میں نظم کی موافقت میں شوق وجذبہ کا رشتہ پیدا کرنا ہے۔جب یہ رشتہ بندھ جاتا ہے۔تو استاد ان دونوں کے درمیان سے الگ ہوجاتا ہے۔نظم کی بلند اور اعلیٰ تخیلی دنیا اور طلباء کی ذہنی دنیا۔ان دونوں کائنات کے درمیان جو شعوری فاصلہ ہے اس کو قریب سے قریب تر کرنا یا ختم کرنا ستاد کا کام ہے۔ورنہ یہ فاصلہ مٹ جانے پر ہی قاری شاعری کی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے۔اور اس داخلہ کے لئے کسی تیسرے فریق کی ضرورت نہیں پڑتی اور قاری کو شاعری سے لطف اندوز ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

ابتدائی درجوں میں: نیچے کے درجوں میں تدریسِ نظم ضروری اور مفید ہے۔آج کل Nursery Rhyme سے بہت فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ان درجوں میں نظم کی بلند خواندگی پر زیادہ زور دینا چاہئے۔بچوں کی نظمیں ، دُعائیہ، مناجات ،قومی ترانے ، گیت ،مختصر وآسان غزلوں کو بار بار پڑھوانا مفید اور موثر ہے۔ بسا اوقات اجتماعی بلند خوانی (Chorus) کروانی چاہئے۔جو بچے انفرادی طور پر بلند خوانی سے جھجکتے ہیں۔ان کی حوصلہ افزائی اجتماعی بلند خوانی سے کرنی چاہئے۔استاد بھی ان بلند خوانیوں میں حصّہ لیں اور نمونے کی بلند خوانی دلفریب پیرایہ سے پیش کریں۔استاد کی نظم خوانی جتنی دل نواز ہوگی طلباء کے لئے اتنی ہی موثر ہوگی۔

اونچے درجوں میں: سب سے پہلے سخت وثقیل الفاظ کے معنی بتانا ضروری ہے اگر کوئی تشبیہ استعارہ یا محاورہ ہوتو اس کی توضیح ضروری ہے۔اگر نظم میں کوئی مخفی معنی ہوتو اس کا بھی اشارہ کردینا ضروری ہے۔اس کے بعد استاد کو نمونہ کی بلند خوانی کرنی ہوگی۔ جو موثر کے علاوہ دل فریب بھی ہو۔نمونہ خوانی کے بعد استاد اشعار کے مطالب اور حسن بیان کریں۔ پھر طلباء سے بلند خوانی کروائیں۔اس دوران میں طلباء جہاں تلفظ، ہجے اور املا کی غلطی کریں اسے استاد درست کردیں۔

مطالب وحسن بیان کرتے وقت چھوٹے چھوٹے سوالوں کے ذریعہ یہ معلوم کرین کہ طلباء نفسِ مضمون سے واقف ہوئے ہیں یانہیں

دوبارہ پھر استادنمونہ کی بلندخوانی کریں۔اگرنظم طویل ہےتو بھی ایک دفعہ مکمل بلندخوانی ضروری ہے۔اوراسی طرح چھوٹے چھوٹے سوالوں کے ذریعہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ طلباءنظم کو کہاں تک سمجھے ہیں۔اشعار کے مطلب وحسن کوسمجھنے کے لئے طلباءکوخاموش خوانی کا بھی موقع دینا چاہئے۔طلباء میں تشریح وتوضیح کی عادت ڈالنے کے لئے ان سے یہ دریافت کریں کہ انہیں کون سا شعر یا اشعار زیادہ پسند ہیں اور کیوں پسند ہیں؟ بعض اوقات تدریس نظم سےقبل شاعر کی زندگی پر روشنی ڈالنے سے بھی اشعار کوسمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔گھر کے کام کے طور پر طلباءکونظم،زبانی یاد کرنے پرزور دیا جاتا ہے۔تاکہ وہ اشعار کواپنی بقیہ زندگی میں برمحل استعمال کرسکیں گے۔

سبق کانمونہ　　　عنوان :ہمالہ(اقبال کی ایک نظم)　　　مضمون : اردونظم

تدریس مقاصد: طلباءکو بیانیہ نظم کے اسلوب سے روشناس کرانا۔طلباءکونظم ہمالہ سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کرنا۔　　　طلباءکواقبال کے اسلوب بیان سے متعارف کرانا۔　　　طلباء میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنا۔

طلباء میں بیانیہ نظمیں پڑھنے اور یاد کرنے سے دلچسپی پیدا کرنا۔

سابقہ معلومات: طلباءاسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں پڑھ چکے ہوں گے۔

تمہید: یہاں سابقہ معلومات کی بنیاد پرتمہید نہیں اُٹھائی جائے گی بلکہ اقبال کے ایک شعر سے ہی طلباء میں تحریک ذہنی پیدا کی جائے گی۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا　　　ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستان ہمارا

استادطلباء سےاس شعر کے بارے میں دریافت کرے گا۔

طلباء میں سے چند یقیناً ایسے نکل آئیں گے۔جو یہ جواب دیں گے یہ شعراقبال کا ہے پھر استاد یہ دریافت کرے گا کہ اس شعر میں کس جذبے کی ترجمانی کی گئی ہے۔

اعلان سبق: سوال وجواب کی روشنی میں استاد اقبال کی وطنی شاعری کواجاگر کرنے کی کوشش کرے گا اوراس ضمن میں نظم ہمالہ کومتعارف کرائے گا۔

نمونے کی بلند خوانی: استاد مناسب لب و لہجے کے ساتھ نظم پڑھ کر سنائے گا طلباء اپنی کتابوں میں دیکھیں گے اور غور سے سنیں گے۔

اجمالی جائزہ: نظم کی جانب طلباء کو متوجہ کرانے کے لئے حسبِ ذیل سوالات پوچھے جائیں گے۔

اس نظم میں کس چیز کا ذکر کیا گیا ہے؟ ہمالہ سے شاعر کیوں خطاب کرنا چاہتا ہے۔

ہندوستان کے شمال میں ہمالہ کی کیا حیثیت ہے۔

نظم کا تفصیلی جائزہ: طلباء کے جواب کی روشنی میں استاد ان سے کہے گا کہ اس نظم میں شاعر نے ہمالہ سے خطاب کیا ہے۔ آیئے دیکھیں شاعر نے ہمالہ کو کس نظریئے سے دیکھا ہے اور اس کی عظمت کا اس کو کس قدر احساس ہے۔ نظم سے لطف اندوز کرانے کے لئے ہر بند کو طلباء سے پڑھوایا جائے گا۔ اشعار کی خصوصیات کی جانب انھیں متوجہ کرایا جائے گا اور تشبیہات اور استعارات کی مدد سے محاسن شعری اُجاگر کئے جائیں گے۔

بند نمبر۱: فصیل کشورِ ہندوستان کس کو کہا گیا ہے اور کیوں؟

چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسمان اس مصرعے میں کس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

دیرینہ روزی سے کیا مراد ہے؟ گردش شام وسحر سے کس پہلو کی طرف اشارہ ہے؟

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے، اس مصرعے میں کس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے سے کیا مراد ہے؟

بند نمبر۲: دیدۂ ظاہر سے کیا مراد ہے؟ شاعر نے ہمالہ کو پاسبان کیوں کہا ہے؟

''مطلع اول فلک جس کا ہے وہ دیوان ہے تو'' سے کس پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

سوئے خلوت گاہِ دل دامن کش انسان ہے تو، سے کس کیفیت کی عکاسی ہوتی ہے۔ برف نے بندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر، مصرعے میں دستارِ فضیلت باندھنے سے کیا مراد ہے؟

خندہ زن ہے جو کلاہ مہرِ عالم تاب پر، دستارِ فضیلت کو خندہ زن کیوں کہا ہے؟

بند نمبر۳: عہد کہن کو عمر رفتہ کی آن کیوں کہا ہے؟ کالی گھٹا میں خیمہ زن ہونے سے کیا مراد ہے۔

ثریا سے سرگرم سخن ہونے سے کس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آ ئینہ سیال کس کو کہا گیا ہے اور کیوں؟ دامنِ موجِ ہوا کو رومال کیوں کہا گیا ہے؟

استحسانِ نظم : اس نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟

اس نظم میں آپ کو کون سا شعر پسند آیا؟ پسندیدہ شعر میں کیا خاص بات ہے؟

اسلوب بیان : بیانیہ نظموں میں یہ ایک بہت عمدہ نظم ہے۔ جس میں شاعر نے بھر پور تخیل آرائی کی ہے۔ اس میں حسین بندشیں ہیں اور کلام میں بہت زور بیان پایا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے اقبالؔ نے حب وطن کا جذبہ ابھارا ہے۔

انفرادی بلند خوانی: طلباء سے باری باری نظم کے بند پڑھوائے جائیں گے اور اس بات پر زور دیا جائے کہ پڑھتے وقت تلفظ مصرعوں کی موزونیت اور آہنگ کا خیال رکھیں۔

بزرگوں نے کہا

1

اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

2

بوڑھے طوطے بھی کہیں پڑھتے ہیں

3

اندھا کیا چاہے دو آنکھ

5

بھاگتے چور کی لنگوٹی بہتر

مُرغ کی ایک ٹانگ

جوابات: 1. بوڑھے طوطے بھی کہیں پڑھتے ہیں۔ 2. مُرغ کی ایک ٹانگ۔ 3. اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ 4. اندھا کیا چاہے دو آنکھ۔ 5. بھاگتے چور کی لنگوٹی بہتر

XX- قصیدے کی تدریس کا طریقۂ کار

قصیدہ شعروں کا ایک ایسا مربوط سلسلہ ہے جو کسی مذہبی پیشوا، بادشاہ یا کسی اہم زندہ شخصیت کی تعریف میں لکھا جائے۔ بادشاہوں اور راجاؤں کے زمانے میں شاعر دربار سے وابستہ ہوتے تھے اور وہ مختلف موقعوں پر بادشاہوں اور امیروں کی تعریف میں قصیدے لکھ کر دربار میں پیش کیا کرتے تھے اور انعام پاتے تھے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا آگے چل کر قصیدے کم لکھے جانے لگے اور جو لکھے گئے وہ بھی یا تو مذہبی رہ نماؤں اور پیغمبروں کی تعریف میں تھے یا پھر ایسے رہ نماؤں کی تعریف میں تھے جو اپنے دور میں عزت اور وقار رکھتے تھے۔

قصیدہ کسی بھی بحر میں لکھا جا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ قصیدے کا ہر شعر ایک ہی ردیف اور قافیے میں ہوگا اور پورا قصیدہ ایک ہی شخص کی تعریف میں کہا جائے گا۔ قصیدے کی خوبی گریز اور مدح کی مضمون آفرینی میں ہے یعنی شاعر جتنا با کمال ہوگا اتنے ہی نئے پہلو اور نئے مضامین پیدا کرے گا۔

کسی کی تعریف کرنا یوں تو بڑا آسان لگتا ہے لیکن جب ان گنت لوگ اپنے اپنے طریقے پر تعریف اور مدح کے مضمون باندھتے آئے ہوں تو ان میں نیا مضمون یا کوئی نیا پن پیدا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور اس نئے پن ہی کو قصیدہ نگار کی بڑائی کی پہچان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مدح یا تعریف تک پہنچنے سے پہلے قصیدے کا ابتدائی حصّہ آتا ہے۔ اور اگر شروع کا حصّہ دل کش اور شاعرانہ حیثیت سے پُر اثر نہ ہو تو قصیدے کے باقی حصّے تک پہنچنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے قصیدے کے ابتدائی حصے کو قصیدہ کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے اور شاعر کا کمال اس میں ہے کہ وہ اس ابتدائی حصے سے اچانک کس طرح مدح کے مضمون تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح ہر قصیدہ اپنی وحدت کے باوجود مندرجہ ذیل حصّوں سے عبارت ہوتا ہے۔ قصیدے کے بنیادی اجزاء حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ تشبیب یعنی ابتدائی حصّہ ۲۔ گریز ۳۔ مدح جس میں سراپا، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، بہادری سخاوت اور دیگر خوبیوں کا بیان بھی ہوتا ہے۔ ۴۔ دعا (دعا کے ساتھ شاعر اپنا مدعا یا حسن طلب بھی نظم کرتا ہے) ۵۔ خاتمہ

قصیدے کے ان اجزا کا تذکرہ ضروری ہے کیونکہ دوسری مختصر نظموں کے برخلاف کلاس میں پوری نظم کی بلند خوانی قصیدے پڑھاتے وقت نہیں کی جا سکتی قصیدے کی تدریس سے پہلے مختصر طور پر ممدوح اور شاہ دونوں کا تعارف ضروری ہے اگر دوسرے اہم شاعروں نے بھی اسی شخص کی مدح لکھی ہو تو ان قصیدوں کے بھی چند اشعار مثال اور مقابلے

کے لئے پیش کئے جاسکتے ہیں اس کے بعد قصیدہ کا ایک ٹکڑا۔ اور ظاہر ہے کہ ابتدا میں یہ ٹکڑا تشبیب ہی کا ہوگا۔ کلاس میں پڑھا جانا چاہئے۔ اس ٹکڑے میں گریز کے اشعار کو شامل کرنا مناسب ہوگا۔

مقصد یہ ہے کہ طالب علم ندرت اظہار کو سمجھ سکیں اور یہ اندازہ لگا سکیں کہ شاعر نے کس حد تک حیرت کے عنصر کو قائم رکھتے ہوئے تشبیب کے اشعار سے مدح کا مضمون نکالا ہے۔ اور پڑھنے والوں کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کردیا ہے۔ یہ دراصل ایک قسم کی مضمون آفرینی ہے جو تخیل کی تربیت کرتی ہے اور ادب کے طالب علم کو نئے مضامین تلاش کرنے اور نئے نئے پہلو تلاش کرنے کی مشق بہم پہنچاتی ہے۔

تشبیب کے اشعار ختم کرنے سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی وجہ تسمیہ پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ مختصراً یہ بھی بتادیا جائے کہ قصیدہ ہماری شاعری میں عربی سے آیا جہاں ہر قسم کی ادبی تخلیق کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ غزل بے ارادہ غیر شعوری اور کسی حد تک الہامی تخلیق جو گویا شاعر پر غیب سے نازل ہوتی تھی اور قصیدہ ارادے سے شعوری طور پر لکھی جانے والی تخلیق تھی۔ قصیدے کا شمار شعوری تخلیق میں کیا جاتا تھا۔ عرب جوشیلے اور عاشق مزاج تھے۔ شاعری میں عشقیہ مزاج ہے یا پھر جنگ وجدل میں قبیلوں کے بہادروں کا جی بڑھانے والی شاعری ہے۔ قصیدے کا تعلق عشق ورومان سے تھا اور قصیدے میں دل دوزی اور دل گدازی پیدا کرنے کے لئے شاعروں نے ایک خاص طریقہ ایجاد کیا تھا۔ وہ اپنے قصیدے بیتی ہوئی رومانی یادوں سے شروع کرتے تھے اور ان وادیوں کو خطاب کرتے تھے جہاں کبھی ان کی اپنی محبوبہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ چونکہ اس ابتدائی حصّے کا تعلق شباب اور اس کی یادوں سے ہوتا تھا اس لئے اس حصّے کا نام تشبیب پڑ گیا۔ تشبیب سے شاعر ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ گریز کرتا ہے اور تشبیب کے مضامین کو ممدوح کی ذات اور صفات سے جوڑ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر سوداؔ نے تشبیب کے نئے نئے مضامین باندھے ہیں اور انھیں ممدوح کی تعریف سے جوڑ دیا ہے۔ مثلاً   فجر ہوتے جوگئی آج مری آنکھ جھپک

دی وہیں آ کے خوشی نے درِ دل پر دستک

درخواب میں ایک خوبصورت کامنی شاعر کو بشارت دیتی ہے کہ آج اس شخص کی سالگرہ کا جشن منایا جارہا ہے۔ جو انسان کی صورت اور فرشتوں کی سیرت کا مالک ہے اور اس گریز سے نواب عمادالملک کی تعریف شروع ہوتی ہے۔

غالبؔ نے بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں قصیدہ چاند سے خطاب سے شروع کیا ہے۔

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام

جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

گریز کے بعد مدح کا مرحلہ آتا ہے اور مدح گوئی میں قصیدہ نگار شاعر کس طرح نئے نئے مضمون پیدا کرتا ہے اور تعریف کے نئے گوشے نکالتا ہے۔ یہی طلباء کے ذہن نشین کرانے کی بات ہے کیونکہ اس مرحلہ میں شاعر تخیل کے ذریعے مضمون آفرینی کا مظاہرہ کرتا ہے اور بیان کی قدرت دکھاتا ہے۔ جو ادب کے طالب علم کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے اس کے علاوہ مدح کے لئے جوش و خروش اور چُستی و بندش بھی لازم ہے یہاں جوش و خروش سے مراد کسی قسم کی جذباتی شورش نہیں ہے بلکہ صرف یہ مراد ہے کہ شاعر جو مضمون باندھے وہ ڈھیلا ڈھالا بے نمک اور بے کیف نہ ہو۔ بات پوری طرح مربوط ہو اور دل سے نکلی معلوم ہوتی ہو اگر مبالغہ بھی ہو تو کم سے کم لطف سے خالی نہ ہو۔

اردو میں قصیدہ نگاری میں سوداؔ کا مقام سب سے بلند ہے سوداؔ اپنے قصیدوں میں جا بجا فارسی قصیدوں سے اثر قبول کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مدح کے نت نئے پہلو نکالتے ہیں۔ سوداؔ کے قصیدوں سے اس قسم کی مثالیں فراہم کر کے قصیدے کے متعارفی لیکچر ہی میں طلباء کے سامنے پیش کرنی چاہئے۔

مدح کے بعد حسن طلب اور دعا کی منزلیں ہیں ان میں بہت کم قصیدہ نگار کامیاب ہوئے ہیں بعض نے بات کو گھما پھرا کر شاعرانہ انداز میں نظم کیا ہے۔ بعض نے براہ راست عرض مطلب کیا ہے جس کی شاید سب سے دل کش مثال غالبؔ کے قصیدے میں ہے۔ آپ کا بندہ اور پھروں ننگا

آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

قصیدے کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے طالب علم کے ذہن سے قصیدے کی وحدت کی تصویر مدھم ہونے لگے گی۔ اس لئے کلاس میں اس وحدت تاثر کو قائم رکھنے کے لئے پھر قصیدے کی ابتدائی اشعار کی طرف رجوع کرنا مناسب ہوگا۔ اور ابتدائی اشعار میں ممدوح کی تصویر کی طرف اشارہ کرنا موزوں اور مفید ہوگا۔ اچھے قصیدوں کے ابتدائی اشعار میں ممدوح کی ذات اور صفات کی کوئی نہ کوئی بلیغ اشارہ ضرور ہوتا ہے۔ گو ابتدا میں اس کا اندازہ نہیں ہوتا غور کرنے پر اس لطیف ربط تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔ (اسے صفت براعتہ استہلال کہا جاتا ہے) مثلاً سوداؔ کے ایک قصیدہ کا مطلع ہے

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل　　　تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

مطلع میں تیغ کا ذکر موجود ہے اور حضرت علی کی تیغ ذوالفقار کی طرف اشارہ ہے یہ قصیدہ حضرت علی کی مدح میں لکھا گیا ہے۔اس طرح سوؔدا کا ایک دوسرا قصیدہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

سوائے خاک نہ کھینچوں گا منت وستار
کہ سرنوشت لکھی ہے مری بخط غبار

یہاں خاک اور غبار کا ذکر دشتِ کربلا کی یاد دلاتا ہے اور کربلا میں شہید ہونے والا حضرت امام حسین کی مدح میں لکھے جانے والے قصیدے کا نہایت موزوں مطلع ہے۔قصیدے کے بارے میں بعض حلقوں میں یہ بحث اُٹھنے لگی ہے کہ ان کی حیثیت اب محض تاریخی ہے۔ چونکہ اب نہ بادشاہ رہے نہ ان کے دربار نہ وہ زبان کی شان وشوکت رہی نہ انداز بیان کی وہ آراستگی تو پھر اب قصیدے کو کلاس میں پڑھانے اور اردو کے نصاب میں رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہاں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔لیکن طالب علم کے ذہن میں یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ قصیدہ محض تاریخ کا حصہ نہیں ہے کہ اس کے ادبی پیرایۂ اظہار اور تخیّل کے لئے مضمون آفرینی کی کوشش آج بھی ادب کے طالب علم کے لئے بہت کچھ سیکھنے کا سامان فراہم کرتی ہیں یوں بھی بادشاہ اور دربار پوری طرح ختم کہاں ہوئے ہیں ۔ان کی شکلیں رنگ وروپ بدل گئے ہیں۔ جب تک انسان موجود ہے۔تعریف سے خوش ہوتا اور ہجو سے ڈرتا رہے گا اور اس لحاظ سے مدح کے نئے نئے پہلو نکالنے کا فن ترک نہیں ہوسکتا۔البتہ اس کے انداز اور اسلوب بدلتے رہیں گے۔

محاوروں میں رنگ

۱۔ پتا نہیں حارث کو کس نے .... باغ دکھائے کہ وہ اپنی اچھی خاصی نوکری چھوڑ کر ممبئی چلا گیا۔

۲۔ جھولے پر بیٹھی جو ہی نے چلانا شروع کیا اور اس کا چہرہ .... پڑ گیا۔

۳۔ منا بھائی کے ہاتھوں میں پڑی ہتھکڑیوں کو دیکھ کر ماں سینہ پیٹتے ہوئے کہنے لگی ''تو نے میرا منہ .... کر دیا ہے میں تو جیتے جی مر گئی۔

۴۔ آج انسان کا خون .... ہو گیا ہے۔کسی کو کسی کی فکر نہیں ہے۔

۵۔ بے وقوف شامو کی حرکتوں کو دیکھ کر سیٹھ جی کا منہ .... ہو گیا۔

XXI- غزل کی تدریس کا طریقۂ کار

تدریس غزل، تدریس نظم کا ہی ایک حصہّ ہے چونکہ غزل کی ہئیت اور اسلوب انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔اس لئے یہ صنف ایک منفرد طریقۂ تدریس کی متقاضی ہے،غزل کی تدریس، نظم کی تدریس کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے۔ اس عمل میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ استاد غزل کی ساخت، اسلوب اور عہد بہ عہد ترقی سے واقف ہو۔اسے ہر دور کی نمائندہ غزلوں کا شعور ہو اور وہ غزل کا ایک رچا ہوا مذاق رکھتا ہو۔اسی صورت میں وہ اپنے شاگردوں کو غزل سے لطف اندوز کرا سکتا ہے۔غزل اس اعتبار سے ایک مشکل صنف ہے کہ اس میں عام طور سے کوئی ایک مرکزی خیال نہیں ہوتا۔اس کے علاوہ غزل کا اسلوب علامتی اور داخلی ہوتا ہے۔استاد کو چاہئے کہ وہ نظم کے اسباق کی طرح غزل کے سبق کو بھی اچھی طرح تیار کر لے۔تیاری کے بغیر سبق کی تدریس اچھے سے اچھے استاد کو مایوس کر سکتی ہے۔غزل کے سبق کی تیاری میں انتخاب متن، تعین مقاصد اور طریقۂ تدریس سے متعلق تمام امور پر غور کرنا شامل ہے۔

تمہید: نمونۂ سبق غزل (غالب)

کیوں جل گیا نہ تابِ رخ یار دیکھ کر جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے سرگرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر
آتا ہے میرے قتل کو پُر جوش رشک سے مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ہم کو حریص لذّتِ آزار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

اشارات سبق

مضمون: اردو موضوع: غالبؔ کی غزل مقاصد سبق:

(الف)عمومی: (۱) طلبہ میں ادبی تحسین کا مادّہ پیدا کرنا اور جذباتی پختگی و استواری حاصل کرنے میں مدد دینا۔
(۲) اشعار کو روانی صحیح تلفّظ اور مناسب زیر و بم کے ساتھ پڑھنے کی مشق بہم پہنچانا۔

(ب)خصوصی: (۱) غزل کے اشعار میں زندگی کے حقائق اور شاعرانہ تخیئل کا جو حیرت انگیز امتزاج پایا جاتا ہے اُس

سے طلباء کو لُطف اندوز اور متاثر ہونے کا موقع فراہم کرنا۔(۲) غالبؔ کے پُر شوکت تخیّل اور ساحرانہ طرز بیان کا احساس پیدا کرنا۔(۳) صنف غزل کی علامتی اور رمزی حیثیت کو واضح کرنا۔

تمہید سبق: طلباء کے ذہنی عمل کو حرکت میں لانے اُن کے شوق کو بیدار کرنے، ان کی سابقہ معلومات کو تازہ کرنے اور مجموعی طور پر غزل کی تدریس وتحسین کے لئے ایک سازگار ماحول پیدا کرنے کی غرض سے حسبِ ذیل تمہیدی گفتگو کی جائے گی۔

(۱) دنیا میں ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔داخلی اور خارجی۔مثال کے طور پر کتاب کو لیجئے۔کتاب کا داخلی پہلو کیا ہے؟ وہ مطالب جو اس میں بیان کئے گئے ہیں۔اور خارجی پہلو؟ کتاب کی ظاہری شکل وصورت، طباعت، چھپائی، جلد بندی وغیرہ۔یا مثلاً خود انسان کو لیجئے۔انسان کا داخلی پہلو کیا ہے؟ اس کے خیالات وافکار، اس کا باطن، اس کا ضمیر اور خارجی پہلو؟ اس کی ظاہری شکل وصورت لباس، چال ڈھال، حرکات وسکنات، اسی طرح شاعری کے بھی دو پہلو ہوتے ہیں۔داخلی اور خارجی۔

(۲) شاعری کے داخلی پہلو سے ہم کیا مراد لیتے ہیں؟ وہ جذبات، احساسات اور جمالیاتی تجربات جن کی ترجمانی کی جاتی ہے۔شاعری کا خارجی پہلو کیا معنی رکھتا ہے؟ وزن وبحر، ردیف وقافیہ، مصرعوں کی ترتیب، زبان اور اندازِ بیان۔گویا شاعری کے داخلی پہلو سے مراد ہے، کیا کہا گیا؟ اور خارجی پہلو کا مطلب ہے کیونکر کہا گیا؟ ان دونوں پہلوؤں کے لئے تنقید کی زبان میں مختلف اصطلاحیں رائج ہیں جو یہ ہیں۔

داخلی یا اندرونی پہلو	خارجی یا ظاہری پہلو
(۱) کیا کہا گیا؟	(۱) کیونکر کہا گیا؟
(۲) خیال	(۲) زبان وبیان
(۳) مضمون	(۳) طرزِ ادا
(۴) موضوع	(۴) ہئیت
(۵) مادہ	(۵) صورت
(۶) مواد	(۶) اسلوب

(۳) اب شاعری کی دوسری صنفوں کو چھوڑ کر صرف غزل کو لیجئے۔ غزل میں مواد اور موضوع کی نوعیت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ ابتدا میں غزل صرف عشقیہ موضوعات کے لئے مخصوص تھی لیکن یہ صورت زیادہ دیر قائم نہ رہی اور جلد ہی شعراء نے غزل میں فلسفیانہ، عارفانہ اور اخلاقی مضامین بھی داخل کر دیئے۔ اب غزل کا دامن اتنا ہی وسیع ہے جتنی خود انسانی زندگی۔

غزل کی ہئیت اور خارجی اسلوب کے اہم عناصر کیا ہیں؟ پہلے شعر میں جسے مطلع کہتے ہیں۔ دونوں مصرعے قافیہ و ردیف کا پابند ہوتا ہے۔ آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلّص استعمال کرتا ہے۔ مقطع کہلاتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ غزل ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔ مفہوم مسلسل نہیں ہوتا،

(۴) اب غزل کے خارجی اسلوب اور انداز بیان کے ایک اور اہم عنصر کی بابت ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ غزل میں بات براہِ راست جوں کی توں اور سیدھے سادھے طور پر نہیں کہی جاتی، بلکہ گھما پھرا کر، ذرا ڈھکے چھپے انداز میں، ایک پُر پیچ طریقے سے، اشارات، استعارات اور تمثیلات کے ذریعے کہی جاتی ہے۔ استعارہ وتشبیہ اور کنایہ وتمثیل ایسی چیزیں ہیں۔ جن سے میں ہر قسم کی شاعری میں کام لیا جاتا ہے، لیکن غزل میں ان کا استعمال بہت زیادہ اہتمام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک مشہور شعر ہے۔

پھول کھل کر کچھ بہار اپنی صبا دکھلا گئے　　　　حسرت اُن غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

شعر کا اصلی مفہوم کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ غنچہ وگل کے ذریعے شاعر نے انسانی زندگی کے اس المیے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ کتنے ہی ہونہار افراد اس دنیا میں پنپنے اور پھلنے پھولنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ یعنی قدرت اُن کو اس کا موقع ہی نہیں دیتی کہ وہ اپنی اہلیتوں کو بروئے کار لائیں۔ ایک اور شعر ہے۔

اے شمع! تیری عمر طبیعی ہے ایک رات　　　　ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

یہاں شاعر شمع اور گریۂ شمع کے وسیلے سے کس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے؟ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ زندگی کا وقفہ بہت مختصر ہے اور انسان کو چاہئے کہ اس قلیل مدّت میں جو کچھ زیادہ سے زیادہ کر سکے کر ڈالے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ غنچہ وگُل، شمع اور شمع کا جلنا دراصل اشارے ہیں اور اظہار خیال کے ذریعے ہیں۔ ان کے علاوہ اُردو غزل میں اور بھی بہت سے کلمات مستعمل ہیں۔ جو اپنے اصلی اور لفظی معنوں میں استعمال نہیں کئے جاتے، بلکہ بیان واظہار کے وسیلے

اور واسطے خیال کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے کچھ اور کلمات بتائیے۔ گُل و بلبل، طور وکلیم، دار ومنصور، برق وشرر، مرغ وقفس، دام وصیّاد، منزل وکارواں وغیرہ۔ ان کلمات کی اہمیت رمزی اور علامتی ہے۔ یہ سب اُردو شاعری کی خاص علامتیں ہیں۔ ان کو ہم غزل کے علائم ورموز بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۵) غزل میں ان علائم ورموز کا استعمال یہ معنی رکھتا ہے کہ جب غزل کا کوئی شعر ہمارے سامنے آئے تو پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس شعر کے ظاہری معنی یا سامنے کا مطلب کیا ہے۔ اُس کے بعد یہ معلوم کرنا چاہئے کہ مختلف علامتوں کے ذریعۂ شاعر نے زندگی کی کس حقیقت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ گویا غزل کا شعر ایک ایسے کٹورے یا پیالے کی مانند ہوتا ہے جس پہ ایک خوب صورت اور رنگین ریشمی رومال پڑا ہوا ہو۔ جب تک ہم رومال کو ہٹا کر نہیں دیکھیں گے یہ نہیں جان سکیں گے کہ پیالے یا کٹورے میں کیا ہے۔ مطلب یہ کہ جب تک ہم علامتوں کی نقاب شعر کے چہرے سے نہیں ہٹائیں گے شعر کے حقیقی مفہوم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

اظہارِ مقصد: آج ہم غالب کی ایک غزل کا مطالعہ کریں گے۔ اور علاوہ دوسری باتوں کے یہ بھی جاننے کی کوشش کریں گے کہ اردو کے بڑے شاعروں نے غزل کے رموز وعلائم کو کس طرح استعمال کیا ہے اور ان سے کیونکر فائدہ اُٹھایا ہے۔

متن سبق: (i) پوری غزل کی تعارفی بلند خوانی: (ii) اشعار کی فرداً فرداً تدریس۔ ہر شعر کے سلسلے میں طریق کار یہ اختیار کیا جائے گا کہ ایک یا دو مرتبہ شعر کی تعارفی بلند خوانی ہوگی۔ پھر مفہوم کے بارے میں سوالات کئے جائیں گے۔ سوالات وجوابات کے ذریعے نہ صرف مطالب کی توضیع بلکہ ضمنی طور پر مشکل اور تشریح طلب الفاظ وتراکیب کی تشریح بھی کی جائے گی۔ مزید برآں ایسے تمام ذرائع اختیار کئے جائیں گے۔ جن کی مدد سے علائم ورموز کی اصل اہمیت اور اشعار کے حقیقی مفہوم کی وضاحت ہو سکے۔

پہلا شعر: کیوں جل گیا نہ تاب رُخ یار دیکھ کر   جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

سوالات ومباحث : (۱) اس شعر میں جلنا دو جگہ دو مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور دوسرے مصرع میں اس کا کیا مفہوم ہے؟ (۲) اس شعر میں دراصل جذبۂ رشک کی ترجمانی ہے شاعر کو اپنے اوپر، اپنی قوتِ برداشت پر اور طاقت دیدار پر رشک آتا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ حسنِ محبوب کی آب وتاب اور چمک دمک اس کو جلا کر خاک نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے رشک کا یہ ذکر محض پیرائیہ بیان ہے۔ اس کی اہمیت محض علامتی ہے۔ شاعر نے مضمون رشک کے ذریعے دراصل کس

خیال کی ترجمانی کی ہے۔ایک طرف رُخ محبوب کی تابانی اوراس کا حسنِ جاں سوز۔دوسری طرف اپنے جذبۂ عشق کی شدّت (۳) بالکل یہی مضمون غالبؔ نے ایک اورغزل میں زیادہ صاف لفظوں میں ادا کیا ہے؟

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے　　میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

(۴) اصل یہ ہے کہ یہ غالبؔ کا بڑا ہی محبوب اور پسندیدہ مضمون ہے اور انھوں نے جگہ جگہ اس موضوع پرلا جواب شعر کہے ہیں۔مثلاً یہ دوشعر دیکھئے

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے در کا نام لوں　　ہراک سے پوچھتا ہوں کہ جاوں کدھر کو میں

نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا　　کیونکر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

دوسرا شعر:

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے　　سرگرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

سوالات ومباحث: (۱) آتش پرست کون ہیں اورآگ کے بارے میں اُن کا کیا عقیدہ ہے؟ (۲) شاعر کے خیال میں لوگ اُسے آتش پرست کیوں کہتے ہیں؟۔(ضمناً سرگرم نالہ ہائے شرر بار کی تشریح کی جائے گی)۔

(۳) اگر ظاہری علامتوں سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو شعر کا کیا مطلب نکلتا ہے۔شاعر شدتِ آہ وفغاں کو ظاہر کرنا چاہتا ہے۔اوربس!

تیسرا شعر:　آتا ہے مرے قتل کو پُرجوش رشک سے　　مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

سوالات ومباحث: (۱) مرتا ہوں کس لفظ کی رعایت سے آیا ہے؟ اورکن معنوں میں استعمال ہوا ہے؟ قتل کی رعایت سے آیا ہے اور فریفتہ ہونے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔(۲) شعر کا ظاہری مطلب کیا ہے؟ (۳) جوشِ رشک سے مرنا''محض پیرائیہ بیان ہے۔اس پیرائیہ بیان کے ذریعے شاعر دراصل کیا کہنا چاہتا ہے؟۔محبوب کے حسن کی تعریف اورشدّت عشق کا اظہار۔(۴) اس شعر میں اورمطلع میں کیا مماثلت پائی جاتی ہے؟

چوتھا شعر: واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ　　ہم کو حریص لذّتِ آزار دیکھ کر

سولات ومباحث: (۱) قاتل کس چیز پر حریص تھا؟ اورکس ہوس میں مبتلا تھا؟ (۲) محبوب پر اُس کا کیا اثر ہوا؟

(ضمناً ہاتھ کھینچنا کی تشریح کی جائے گی۔ فارسی کی دست کشیدن کا ترجمہ ہے) (۳) ستمِ محبوب اورلذت آزار کے پیرایئے میں شاعر نے زندگی کی کس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے؟ انسان کی ازلی بدنصیبی (۴) جواس شعر کا مضمون ہے وہ زندگی کی ایک معروف حقیقت اورایک عام انسانی تجربہ ہے۔اور اردوغزل میں اس کا اظہار مختلف پیرایوں میں خوب خوب کیا گیا ہے۔وہ مشہور مصرع آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ع

ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

پانچواں شعر: گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر! دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سوالات ومباحث: (۱)طُور اور برق تجلی کی روایت کیا ہے؟ (اس سلسلے میں صنعت تلمیح کی وضاحت کی جائے گی (۲) شاعر کہتا ہے کہ برق تجلّی طور کی بجائے ہمارے اُوپر گرنی چاہئے تھی۔کیوں؟ طور کا ظرف ایسا نہیں تھا کہ اس کا متحمل ہوسکتا۔اس لئے پاش پاش ہوگیا۔ہمارے ظرف کی بڑائی البتہ اس کی حریف ثابت ہوسکتی ہے۔(ضمناً قدح خوار کی تشریح کی جائے گی۔ (۳) طُور برِق تجلّی ، بادہ اورقدح خوار کی علامتوں کوعلیٰحدہ کرنے کے بعد شعر کا کیا مطلب نکلتا ہے؟ عالی ظرفی، عالی ہمتی، بلندحوصلگی کا اظہار۔

چھٹا شعر: سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا یادآ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

سوالات ومباحث: (۱) سر پھوڑنے کا سبب کیا تھا؟ شوریدہ حالی،شوریدہ سری، دیوانگی، جو بذاتِ خود نتیجہ ہے عشق کا یاعشق کا دوسرا نام ہے۔(۲) دیوار کا استدلال محض رعایت لفظی ہے یا شعر کی معنویت ہے اس کا کوئی حقیقی تعلق بھی ہے؟ دیوار کا لفظ ''سر پھوڑنا'' کی رعایت سے لایا گیا ہے۔لیکن معنی ومفہوم کے لحاظ سے اس شعر کی جان ہے۔شعر کی ساری تاثیر اسی ایک لفظ سے وابستہ ہے۔کسی دیوانے کا جنون کی شدت میں محبوب کی دیوار سے سر پھوڑ کر مرجانا اور پھر دیوار کو دیکھ کر کسی کے دل میں اُس دیوانے کی یاد کا تازہ ہونا ایسا الم ناک اوراثر آفریں تصور ہے کہ اس کو بیان نہیں کیا جاسکتا صرف محسوس کیا جاسکتا۔

اعادہ سبق: سوالات:

(۱) مجموعی طور پر غالبؔ کی یہ غزل کیا تاثر چھوڑتی ہے؟ غزل کی جو عام فضا ہے۔اُس کو ہم الفاظ میں ادا کرنا چاہیں تو

کیا کہیں گے؟ غزل کے سب سے حاوی رجحان یا غالب ترین آہنگ کا پتہ چلانے کی کوشش کیجئے۔
(۲) اس غزل کو معنوی انتشار اور فکری پراگندگی کا مظہر خیال کیا جائے گا یا جذباتی و کیفیاتی وحدت کا نمونہ؟
(۳) اس غزل کا وہ کون سا شعر ہے جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اور اکثر موقعوں پر ہماری زبان پر رواں ہو جاتا ہے۔ (۴) وہ شعر کون سا ہے جس میں زندگی کے ایک بے حد عام تجربے کو ایک نہایت دل فریب شاعرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے؟ (۵) اس غزل کا کون سا شعر آپ کو سب سے زیادہ پسند آیا؟ (۶) اس غزل کے مختلف اشعار میں اردو غزل کی کن کن مخصوص علامتوں کا استعمال ہوا ہے؟

انداز اپنا اپنا

1 نو سو کھا کے حج کو چلی

کہاوت کا انداز ہے:

(1) خوشامدانہ

(2) طنزیہ

(3) ناصحانہ

2 گھر کی برابر

یہ کہاوت کب استعمال کی جاتی ہے

(1) نصیحت کے لئے

(2) تعریف کے لئے

(3) بے قدری کے اظہار کے لئے

3 اپنی گلی میں بھی ہوتا ہے

کس موقعہ پر یہ کہاوت استعمال کی جاتی ہے۔

(1) جب کوئی اپنی حیثیت سے بڑھ کر کام کرے

(2) جب کوئی ہر کام کو ناممکن سمجھے۔

(3) جب کوئی کمزور اپنے گھر میں خود کو طاقت ور سمجھے۔

جوابات: (1) طنزیہ (2) بے قدری کے اظہار کے لئے (3) اپنے گھر پر کمزور کا طاقتور سمجھنا

XXII- قواعد کی تدریس کا طریقۂ کار

زبان کی سائنس کو قواعد کہتے ہیں۔ ہر زبان کی ادائیگی میں اس کے تلفظ، اس کے ہجے اس کی تذکیر و تانیث میں ایک ضابطہ یا طریقہ پایا جاتا ہے اور یہی طریقے اس زبان کو بے ضابطگی اور بے قاعدگی سے بچاتے ہیں۔ اس ضابطے یا طریقے کو قواعد یا گرامر کہتے ہیں۔ قواعد کا اصل نظریہ اور مقصد زبان کا صحیح استعمال ہے۔ ڈاکٹر ایچ سوئٹ نے کہا ہے۔ "Grammar is the practical analysis of a language, its anatomy" زبان اور اس کی ساخت کا عملی تجزیہ قواعد کہلاتا ہے۔

تدریسِ قواعد کا مقصد:

قواعد کا مقصد زبان کا صحیح استعمال یعنی صحیح بولنا، صحیح لکھنا، صحیح پڑھنا اور صحیح سمجھنا ہے۔ تدریس قواعد کے سلسلے میں درج ذیل امور قابل غور ہیں۔

۱۔ قواعد سے زبان کی ساخت کا علم ہوتا ہے۔ اور اس لحاظ سے قواعد صحت زبان و بیان کے حصول کا ذریعہ ہے۔

۲۔ قواعد لسانی لغزشوں سے بچاتے اور روکتے ہیں۔ (۳) کسی بھی زبان کے طالب علم کے لئے اس کی اشد ضرورت ہے۔ (۴) قدیم مفکرین بھی لسانی تربیت کے لئے قواعد کو ناگریز خیال کرتے تھے۔ (۵) جدید مفکرین سمجھتے ہیں قواعد کی پہلی سی اہمیت نہیں رہی۔ (۶) جدید مفکرین کی رائے مین قواعد کا نصاب اور اس کا طریقِ تعلیم ناقص ہے۔ (۷) جدید مفکرین کے نظریے کا اثر یہ ہے کہ اکثر مدارس میں قواعد کی طرف سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ (۸) قواعد سے بے اعتنائی کا نتیجہ یہ ہے کہ صحتِ زبان تدریسی فضا میں بھی مفقود ہے۔ (۹) ہر زبان کے لئے مادری زبان کا سا ماحول پیدا کرنا مشکل ہے۔ بلکہ ناممکن ہے۔ (۱۰) مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں پر قابو پانے کا بہترین ذریعہ قواعد ہے۔ بہ شرطیکہ اس کا طریق تعلیم صحیح ہو۔

قواعد کے تربیتی مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) عملی مقصد: عملی مقصد سے مراد یہ ہے کہ صحیح لکھا جائے اور صحیح بولا جائے۔

(ب) تربیتی مقصد: اس سے مراد جملے کی تحلیل وتجزیہ ہے۔اس سے ہمیں اظہارِخیال میں بھی مدد ملتی ہے اور دوسروں کی باتیں سمجھنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔گرامر کے تربیتی مقصد کے بغیر جملوں کی صحت ناممکن ہے۔

(ج) امتحانِ ادب میں امداد کا مقصد: قواعد کے جاننے سے ادب کی خوبیاں آشکار ہوتی ہیں۔

(د) تعارفی مقصد: قواعد سیکھنے سے زبان کی فصاحت وبلاغت سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

قواعد کی قسمیں: کیفیت ونوعیت کے لحاظ سے قواعد کی کئی قسمیں ہیں۔

(۱) علمی قواعد: جس میں قواعد کے اصولوں اور تعریفوں کو رٹایا جاتا ہے۔

(۲) عملی قواعد: جس میں زیادہ تر زور عمل پر دیا جاتا ہے۔

(۳) مکمل قواعد: وہ ہے جس میں تمام چھوٹے بڑے اصول سمجھائے جاتے ہیں۔

(۴) منتخب قواعد: وہ ہے جس میں صرف بیشتر کام آنے والے چند اصول سمجھائے جاتے ہیں۔

(۵) مترتّب قواعد: جس میں تمام اصول بالترتیب بیان کئے جاتے ہیں۔

(۶) حسب ضرورت قواعد: غیر مترتب طور پر وہ اصول سمجھائے جائیں جن کی تدریس کے دوران اچانک ضرورت پڑ جاتی ہے۔اس میں ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

(۷) مربوط قواعد: جن کی تدریس سبق کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔اس کے لئے علٰحدہ کتابیں نہیں ہوتیں۔

(۸) غیر مربوط قواعد: جن کی تدریس مطالعہ کے ساتھ ساتھ نہیں ہوتی اس کے لئے علٰیحد کتاب مقرر ہوتی ہے۔

قواعد سیکھنے کے فوائد:

(۱) مادری زبان چونکہ بچپن کی زبان ہوتی ہے۔اس میں غلطیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔اس کی درستگی قواعد سے ہوسکتی ہے۔(۲) قواعد کی تعلیم اچھی ہوگی تو زبان وادب کا اظہار بھی خوبصورت ہوگا۔(۳) زبان اگر جسم ہے تو قواعد اس کی ہڈیاں اور اظہار اس کا حُسنِ تمکنت،حسن کو نکھارنے کے لئے جسم اور ہڈیوں دونوں کی ساخت کا جاننا ضروری ہے۔

(۴) الفاظ کا صحیح استعمال تدریس قواعد کے ذریعے ہوسکتا ہے۔(۵) مادری زبان کے قواعد سے واقف ہونے پر دوسری زبان کی تعلیم بھی آسان ہوجاتی ہے۔مثلاً انگریزی کا Tensel سمجھنے میں اردو کا ''زمانہ'' بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔

(۶) عام زبان اور ادبی زبان روز بہ روز قریب تر ہوتی جارہی ہے۔اس لئے قواعد کا استعمال ضروری ہے۔تاکہ تلفظ الفاظ

صحیح اور واضح ہو۔(۷) جن زبانوں میں اعراب کی تبدیلی سے معنی بدل جاتے ہیں۔ہم معنی، ہم آواز یا مختلف معنی والے الفاظ ہوتے ہیں وہاں تدریس قواعد ضروری ہے۔(۸) اردو زبان اپنی وسعت اور حسن کے لئے فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کی رہین منت ہے اس کے سخت اور ثقیل الفاظ نکال کر زبان کو آسان بنایا جاتا ہے اور یہ کام قواعد کا ہے۔

(۹) زبان کی ساخت اس کی ترکیب وترتیب، استعمال وعمل نہیں معلوم ہونے سے زبان پر دستِ رس یا عبور حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ کام صرف قواعد ہی کرسکتی ہے۔(۱۰) قواعد زبان کی شکل کو بگڑنے سے بچالیتا ہے۔(۱۱) قواعد کے استعمال سے طلباء میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ زبان کا استعمال بلا خوف کرتے ہیں۔(۱۲) قواعد کو جاننے سے دوسری جدید ملکی اور غیر ملکی زبانوں کو سیکھنے میں مدد ملتی ہے۔(۱۳) بہت سے مفکروں کا خیال ہے کہ تدریس قواعد نفسیاتی پہلو سے بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے ذریعے دوسرے مضامین بھی آسانی سے سیکھے جاسکتے ہیں۔

قواعد کی تعلیم سوائے زبان کے اور کسی مضمون میں بھی مددگار ہیں۔

تدریس قواعد کو آسان بنانے کے چند اصول: قواعد کی تعلیم کو جاذب اور دلچسپ بنانے کے لئے درجہ ذیل اصولوں پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

۱۔نصاب: طلباء کی قابلیت، عمر، درجہ، صلاحیت اور عقل کو مدنظر رکھتے ہوئے نصاب تیار کرنا ہوگا۔طلباء جب تک زبان پر کچھ عبور حاصل نہ کرلیں اس وقت تک قواعد کی تعلیم نہ دی جائے۔

۲۔استاد: قواعد کا استاد قواعد میں ماہر ہو۔اس کو اپنے اوپر پورا اعتماد اور بھروسہ ہو۔زبان وادب سے دلچسپی رکھتا ہو تاکہ اسباق کو آسان تر بنا سکے۔

۳۔نصابی کتب: قواعد کی نصابی کتب بڑی ذمہ داری سے تیار کی جائیں۔ ہر جماعت کے لحاظ سے درسی کتب تیار کرنا ہوگا۔تاکہ طلباء قواعد کے ذریعہ زبان کی تشخیص کرسکیں۔

۴۔امدادی ذرائع: تدریس قواعد کے وقت سمعی بصری امدادی ذرائع (Audio, Visual Aids) کا استعمال کرنا بہتر وافضل ہے۔چارٹ اور سیاہ تختی کی مدد سے بچوں کے ذہن پر واضح خیال بن سکتا ہے۔

۵۔اشاراتی اسباق: یہ قواعد کی تعلیم میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

تدریس قواعد کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ مدرسوں میں مندرجہ ذیل طریقوں سے قواعد کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ا۔ اصطلاحی طریقہ: اس طریقہ میں طلباء اصطلاحوں اور تعریفوں کو بار بار رٹتے ہیں۔ بعد میں ان ہی اصطلاحوں کو تمثیل کے ذریعہ استعمال کرتے ہیں۔اس طریقے میں بہت ساری خرابیاں موجود ہیں۔ اس طریقہ میں اسباق خشک اور بے جان ہوجاتے ہیں۔طلباء دلچسپی نہیں لیتے۔طلباء ان اصطلاحوں اور تعریفوں کو بغیر سمجھے حفظ کر لیتے ہیں۔مگر ان کا استعمال نہیں کر پاتے۔اس طرح یہ اصول غیر سائنٹفک ہے۔

۲) لسانی طریقہ: انشا، مضامین، کہانیاں پڑھاتے وقت قواعد کا استعمال سکھایا جاتا ہے زبان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔اس طریقے سے طلباء قواعد کی کتاب پڑھے بغیر صحیح اور سلیس زبان کا استعمال سیکھ لیتے ہیں۔

۳) نصابی طریقہ: ہر اسکول میں مختلف درجوں کے لئے مختلف قواعد کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ قواعد نصاب کے مطابق لکھا ہوا ہوتا ہے۔مختلف اصطلاحوں ، مثالوں، اِشاروں ، اِسموں اور صفتوں کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا جاتا ہے۔اس میں دو اہم خرابیاں ہیں۔اول کتاب کی مرکزیت، دوم رٹنے کی عادت۔

۴) تمثیلی طریقہ: اساتذہ چیدہ چیدہ جملوں کے ذریعہ قواعد سمجھاتے ہیں قواعد کے اصول کو اجاگر کرتے ہیں۔طلباء بھی اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔لیکن مثالوں کا انتخاب بہت ذمہ داری، ہوشیاری اور خوب صورتی سے کرنا چاہئے۔اس طریقہ میں وقت زیادہ لگتا ہے۔اور طلباء ثقیل انتخابوں کو خوشی سے قبول نہیں کرتے۔

۵) تحلیلی طریقہ: قواعد پڑھاتے وقت جب کسی اصطلاح کی تعریف کی جائے اس وقت طلباء کے سامنے بہت ساری مثالیں پیش کی جائیں۔ پھر انہیں مثالوں کا تجزیہ کیا جائے۔اس طریقہ کے لئے مثالیں منتخب شدہ اور سلسلہ وار ہونی چاہیں۔

۶) استقرائی طریقہ (Inductive Method)

اس طریقے کے ذریعے قواعد کی تعلیم بہتر طور پر دی جاسکتی ہے۔ اس طرز کے قواعد کو عملی قواعد یا (Functional Grammar) کہتے ہیں۔اس میں طلباء متعدد واقعات، حقائق یا مثالوں کا تجزیہ کرکے بہ براہ راست کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں اور کوئی اصول، ضابطہ یا کلیہ اخذ کرتے ہیں۔ اس طریقے کو استقرائی طریقِ تدریس

کہا جاتا ہے۔اس طریقے میں معلم طلباء کو مخصوص واقعات اور مثالوں کے ذریعے تجربے، مشاہدے اور مطالعے کا موقعہ فراہم کرتا ہے۔طلباء معلم کی رہنمائی میں مثالوں کا تجزیہ، باہم مقابلہ اور موازنہ کر کے ان کے درمیان مماثلت اور فرق کو محسوس کرتے ہیں اور حقیقت تک پہنچتے ہیں۔مثلاً دادی اماں مر گئیں، نانا میاں چل بسے، کل جاوید مر گیا۔آج ساجدہ چل بسی۔لوگ مرتے رہتے ہیں۔انسان فانی ہے۔

اس طریقے سے طلباء صحیح زبان کا استعمال کرنا سیکھتے ہیں، قواعد کے اصول وضوابط اور تعریفیں۔جدید تدریس تعلیم کے عین مطابق ہے، اس میں طلباء میں خود سے کچھ سیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے۔وہ اپنی محنت سے حقائق تک پہنچتے ہیں۔اس طریقہ تعلیم سے طلباء میں خود اعتمادی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیق وجستجو کی صلاحیت بھی پیدا ہوتی ہے۔اس طریقے میں طلباء کو (۱) معلوم سے نامعلوم کی طرف اور (۲) مقرون سے مجرد کی طرف لے جایا جاتا ہے۔
(۳) تدریس اصول کے عین مطابق ہے۔(۴) طلباء کے ذہن پر زور نہیں پڑتا ہے۔
(۵) اصول زبانی یاد کرنے نہیں پڑتے۔(۶) تمام اصول بے ربط اور پریشان نہیں رہتے بلکہ اچھی طرح ذہن نشیں ہوجاتے ہیں۔''ان کے ذریعے فکر، فہم اور تعقل کی قوتیں نشو ونما پاتی ہیں۔''

اس طریقۂ کار میں بعض خامیاں بھی ہیں جیسے جلد بازی میں طلباء غلط نتیجے اخذ کر لیتے ہیں۔متعدد پہلوان کے سامنے نہیں آپاتے، چند مخصوص واقعات یا مثالوں سے کوئی کلیہ بنا لیتے ہیں حالانکہ دوسری بہت سی مثالوں پر اس کا ٹھیک انطباق نہیں ہوتا۔

استخراجی طریقہ (Deductive Method): اس طرز کی قواعد کو روایتی قواعد (Formal Grammar) کہتے ہیں۔اس میں معلم خود ہی طلباء کو کوئی عام اصول، ضابطہ یا کلیہ بتا دیتا ہے۔اور مخصوص مثالوں کے ذریعے اس کی وضاحت کرتا ہے۔اس طریق تدریس میں طلباء کو زبردستی تعریفیں اور اصول رٹنا پڑتا ہے۔مثلاً قواعد میں استاد نے اسم، ضمیر، فعل، حرف یا صفت کی تعریف بتا دی۔مثالوں سے واضح کر دیا۔طلباء نے استاد کے علم پر بھروسہ کر کے انہیں مان لیا۔ایک پیراگراف دے کر طلباء سے کہا گیا کہ وہ اس میں سے اسم، فعل، حرف وغیرہ کی نشان دہی کریں۔اگر طلباء ٹھیک نشان دہی کر دیتے ہیں تو سبق کامیاب ہے۔

اس طریقے میں معلم اپنے علم اور تجربات کو قلیل مدت میں طلباء کو منتقل کر دیتا ہے۔بچے از خود سیکھنے سے محروم رہ

جاتے ہیں۔ یہ طریقہ خشک ہے۔ اور تدریس زبان کے اصول کے خلاف ہے کیونکہ اس میں پہلے اصطلاح کو مان لیا جاتا ہے۔ بعد میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ طلباء میں لفظ کی معنویت سمجھنے سے مجبور رہتے ہیں۔ اور زبان کا صحت کے ساتھ استعمال نہیں کرتے ۔ یہ طریقہ نفسیاتی تعلیم کے خلاف ہے۔ معلم کو اس میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ بلکہ اس کا کام آسان ہوجاتا ہے۔ وہ کسی ایک قاعدے یا اصول کے ذریعے طلباء سے متعدد مسائل حل کرواتا ہے۔ یہ طریقہ تدریس کے ضابطہ عمل کے بھی بالکل برعکس ہے۔ تدریس قواعد کے لئے دونوں ہی طریقے ضروری ہیں۔ اصطلاح حاصل کرنے استقرائی اور اسے استعمال کرنے کے لئے استخراجی طریقہ بہتر ہوتا ہے۔

تدریس قواعد کے زرین اصول: قواعد کی تدریس کو مرغوب بنانے کے لئے درج ذیل اصولوں کو ذہن نشین کرلینا چاہئے۔

(۱) تجربہ کار استاد کو یہ کام اپنے ذمہ لینا چاہئے۔ (۲) قواعد کی تدریس کا آغاز جملوں سے ہو۔
(۳) قواعد کی تعلیم مقرون اور عملی بنائی جائے۔ (۴) پہلے استقرائی طریقے بعد میں استخراجی طریقے اپنائے جائیں۔
(۵) طویل مشقیں اور مسلسل انطباق ہونا چاہئے۔ (۶) قواعد کے ضروری امور کی تعلیم دی جانی چاہئے۔
(۷) قواعد کے خواندہ اصولوں کی مشق مطالعہ میں کرائی جائے۔ (۸) عبارتوں کو مختلف معنی میں بدل کر (سوالیہ، نفی، امر وغیرہ) مشق کرائی جائے۔ (۹) خالی جگہوں کو پُر کروا کر بتایا جائے۔ (۱۰) عبارت میں دیئے گئے واحد اسموں کو جمع میں بدلوا کر مشق کرائی جائے۔ (۱۱) عبارت میں دیئے گئے مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر میں تبدیل کروایا جائے۔
(۱۲) ادھوری عبارتوں کو پورا کروا کر مشق کرائی جائے۔ (۱۳) اعلیٰ جماعتوں میں منظّم اور مرتب قواعد پڑھایا جائے۔
(۱۴) اصول اور اصطلاحات کی تعریفیں رٹنے پر زور نہ دیا جائے۔

محاورے

۱۔ چراغ تلے اندھیرا
۲۔ حلوائی کی دکان پر دادا جی کی فاتحہ
۳۔ ایک انار سو بیمار ۴۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام
۵۔ کبوتر چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھولا

XXIII- ترجمہ نگاری کی تدریس کا طریقۂ کار

سترھویں صدی میں جن لوگوں نے اردو میں نثری اور شعری ادب کا آغاز کیا ان کی علمی زبان فارسی تھی۔اسی لئے اردو کے ابتدائی شعری اور نثری سرمائے پر فارسی زبان وادب کا گہرا اثر ہے۔یہ اثر تشبیہات واستعارات،تلمیحات، الفاظ اور فارسی کے اصناف سخن وغیرہ سے مستعار لینے تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ ہزاروں فارسی اشعار کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا گیا۔

اردو ادب کے ابتدائی عہد میں بہت بڑی تعداد میں فارسی ،عربی اور سنسکرت سے اردو نثر میں ترجمے کئے گئے۔ یہ ترجمہ مذہب،تصوف،شاعری،داستانیں،ہیئت،فلسفے کی کتابوں کے تھے۔یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اردو میں پہلا ترجمہ کون سا تھا۔بعض محققین کا خیال ہے کہ شاہ میران جی خدانما نے ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاہ ہمدانی کی تصنیف ''تمہیدات ہمدانی'' کا عربی سے اُردو میں جو ترجمہ کیا تھا وہ اردو کا پہلا ترجمہ ہے۔بعض حضرات کا خیال ہے کہ ملاوجہی نے پہلی بار شاہ جی نیشاپوری کی فارسی تصنیف ''دستور العشاق'' کا اردو میں ترجمہ ''سب رس'' کے نام سے کیا۔1704ء میں شاہ ولی اللہ قادری نے شیخ محمود کی فارسی تصنیف ''معرفت السلوک'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں سید محمد قادری نے فارسی تصنیف ''طوطی نامہ'' کا ترجمہ کیا۔تقریباً اُسی زمانے میں فضل علی فضلی نے ملاحسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب ''روضۃ الشہداء'' کا اردو میں ''کربل کتھا'' کے نام سے ترجمہ کیا ان ترجموں کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ ترجمے باقاعدہ ترجمے نہیں تھے۔ بلکہ کتابوں کی تلخیص (کتابوں کے کچھ مخصوص حصوں کا انتخاب) یا آزاد ترجمہ ہوتے تھے۔ان ترجموں میں ترجمہ کے اصولوں کا لحاظ نہیں کیا گیا تھا۔

عیسائیوں نے جب ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے قدم رکھا تو ان کے مبلغین نے اپنی مذہبی کتابوں کا ترجمہ اور تالیف کر کے شائع کیں۔اٹھارویں صدی کے وسط میں انہوں نے توریت اور انجیل کے اردو ترجمے شائع کئے۔کہا جاتا ہے کہ اس سلسلہ کی پہلی کتاب ''کتاب پیدائش کے پہلے چار بابون کا ترجمہ ہندوستانی'' ہے جس کا ترجمہ بنجمن شولز نے کیا تھا۔اس کے بعد شولز نے کتاب دانیال کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ان تمام کتابون کی تفصیل سی۔اے گریرسن نے اپنی کتاب ''ہندوستان کا لسانی جائزہ جلد نہم میں دی ہے۔

اردو میں قرآن شریف کا پہلا ترجمہ مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی نے کیا۔ یہ لفظی ترجمہ تھا یعنی قرآن شریف کے ہر لفظ کا اس طرح ترجمہ کیا گیا کہ اردو فقروں کی ساخت بالکل بدل گئی۔اس ترجمہ میں سلاست اور روانی نہ ہونے کی وجہ سے اصل مفہوم سمجھنا مشکل تھا۔شاہ رفیع الدین نے یہ ترجمہ 1776ء میں کیا تھا۔تقریباً نو سال بعد یعنی 1795ء میں شاہ رفیع الدین دہلوی کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر دہلوی نے بھی قرآن شریف کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ پہلے ترجمے کے مقابلے میں زیادہ سلیس، شگفتہ اور آسان تھا۔زبان بھی بامحاورہ استعمال کی گئی تھی۔

اب تک اردو میں جتنے تراجم ہوئے تھے وہ انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھے۔پہلی بار فورٹ ولیم کالج کے اہتمام میں منظّم اور باقاعدہ طریقے پر عربی، فارسی اور سنسکرت سے اردو میں ترجمے کئے گئے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا پس منظر یوں بیان کیا جاتا ہے۔ کہ انگریز ٹیپو سلطان کو ہندوستان میں اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔بعض ہندوستانی غداروں کی مدد سے انگریز ٹیپو سلطان کو شکست دینے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی غیر معمولی کامیابی تھی۔اس لئے انگریزوں نے ٹیپو سلطان پر فتح حاصل کرنے کی خوشی میں زبردست جشن منایا۔فورٹ ولیم کالج بھی اسی جشن کی ایک کڑی تھی۔ٹیپو سلطان پر فتح کی پہلی سالگرہ 10/جولائی 1918ء کو بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔اس دن گورنر جنرل ویلزلی نے فورٹ ولیم کالج کا افتتاح کیا۔اس کالج کا اصل مقصد یہ تھا کہ بنگال، مدراس بمبئی کی ریاستوں کے جونیر سول ملازموں کو ہندوستانی زبانیں سکھائی جائیں اور اس کے ساتھ ہی ایسے مختلف علوم کی تعلیم دی جائے۔ جسے حاصل کر کے وہ اپنا سرکاری کام بہتر طریقے سے کر سکیں۔اس کالج میں جن زبانوں کو پڑھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ان میں ہندوستانی یعنی اردو سب سے اہم زبان تھی۔ کالج میں ہندوستانی زبان کا ایک باقاعدہ شعبہ قائم کیا گیا۔اس شعبے کے لئے گل کرسٹ کو پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔گل کرسٹ کو سب سے پہلے جس مشکل کا سامنا کرنا پڑا وہ یہ تھی کہ ہندوستانی زبان پڑھانے کے لئے نصابی کتابیں بالکل نہیں تھیں۔اس لئے انہوں نے سب سے پہلے نصابی کتابیں تیار کرنے کی طرف توجہ کی۔

کالج کے نصاب میں شامل کرنے کے لئے ساٹھ کتابیں تیار کی گئیں۔ان میں تراجم بھی تھے۔ تالیفات اور تصنیفات بھی۔ترجمے پابند بھی تھے اور آزاد بھی۔ پابند ترجمہ اُسے کہا جاتا ہے جس میں اصل زبان کے پورے مفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کیا جائے اور آزاد ترجمہ وہ ہے جس میں مترجم اصل زبان میں مفہوم سمجھ کر اُسے دوسری زبان میں

لکھ دیتا ہے۔فورٹ ولیم کالج میں جن ادیبوں نے اردو میں ترجمے کئے ان کے نام ہیں۔عبداللہ مسکین، کاظم علی جوان، بہادرعلی حسینی، مظہرعلی وِلا، شیرعلی افسوس، حیدربخش حیدری، خلیل علی خان اشک، حمیدالدین بہاری وغیرہ۔

فورٹ ولیم کالج کے بعد اردو ترجمہ کی تاریخ میں دوسرا اہم ادارہ دلّی کالج ہے۔فورٹ ولیم کالج میں انگریزوں کو اردو پڑھانے کے لئے ترجمے کرائے گئے تھے۔جب کہ دہلی کالج میں ہندوستانیوں کومغربی تعلیم دینے کے لئے بڑے پیمانے پر ترجمے کئے گئے۔1792ء میں دہلی کے مدرسے غازی الدین میں مشرقی علوم کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔یہ مدرسہ نواب غازی الدین خان نے قائم کیا تھا۔اس مدرسہ میں تقریباً تیس سال تک عربی، فارسی اورمشرقی علوم کی تعلیم دینے کے بعد 1825ء میں اس مدرسہ کوایک باقاعدہ کالج کی صورت دے دی گئی۔پورے ملک میں یہ واحد کالج تھا جہاں ہئیت، ریاضی، فلاسفی اورتاریخ جیسے مغربی علوم کی تعلیم اردو کے ذریعے دی جاتی تھی۔ایک پریشانی یہ تھی کہ اردو کے ذریعہ مغربی تعلیم کوحاصل کرنے والوں کے لئے اردو نصابی کتابیں نہیں تھیں۔چنانچہ 1841ء میں دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی وجود میں آئی۔اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا کہ ترجموں یا جدید موضوعات پر کتابوں کی تالیف کے ذریعے ہندوستانی زبانوں میں نصاب کی کتابیں فراہم کی جائیں۔

مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ''مرحوم دہلی کالج'' میں اس ادارے کی 128 کتابوں کی فہرست دی ہے۔اس فہرست میں ترجمے بھی ہیں اورطبع زاد کتابیں بھی اردو کے نثری ترجموں کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔اس کے پہلے سکریٹری علامہ شبلی اوران کے بعد مولوی عبدالحق نے بھی خاصی تعداد میں ترجمے کئے۔یورپین زبانوں کے علاوہ عربی فارسی اورسنسکرت سے خاصی تعداد میں ادبیات عالیہ کا ترجمہ کیا گیا۔مولوی وحیدالدین سلیم نے 1921ء میں ''وضع اصطلاحات'' شائع کی جواپنے موضوع پرایک نادر کتاب ہے۔

دارالترجمہ عثمانیہ، حیدرآباد

حیدرآباد دکن سے اسکولوں میں میٹرک اورانٹرمیڈیٹ تک ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ہندوستان میں اردو کے ذریعے مختلف علوم کی تعلیم کا یہ پہلا تجربہ تھا۔جوغیرمعمولی طورپر کامیاب رہا۔مولوی عبدالحق کی تحریک پرسراکبر حیدری اورسرراس مسعود کی مسلسل کوششوں سے 26/اپریل 1917ء میں حیدرآباد کے نواب میرعثمان علی خان نے عثمانیہ یونیورسٹی قائم کی۔جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔یونیورسٹی کے قیام کے فوراًبعد ہی مختلف علوم میں اردو کی منہاجی کتابوں کی ضرورت محسوس